

گوشہ اردو

تدبر قرآن

قرآنی تلاوت غور و فکر سے کرنے کا حکم

جعفر شاہ پھلواڑی

دنیا کی کوئی آسمانی کتاب ایسی نہیں جس نے عقل سے کام لینے پر اتنا ضرور دیا ہو جتنا قرآن نے دیا ہے۔ جتنا قرآن نے دیا ہے۔ عقل و فہم کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو قرآن نے مختلف الفاظ سے واضح کیا ہے مثلاً

۱۔ لفظ حکمت سے و یعلمکم الکتب والحکمة (۱) (یہ رسول تمہیں کتاب اور حکمت و دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔) ومن یوت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا (۲) (جسے حکمت و دانائی عطا ہوئی اسے بے شمار بھلائیاں مل گئیں)

۲۔ لفظ لب سے: وما یذکر الا اولو الالباب (۳) (اہل عقل ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں)

۳۔ لفظ بصیرۃ سے: فاعتبروا یا اولی الابصار (۴) (عقل والو عبرت حاصل کرو)

افلا تبصرون؟ (۵) (تم بصیرت سے کام نہیں لیتے؟)

۴۔ لفظ فقه سے: لو کانوا یفقهون (۶) (کاش یہ سمجھ لیتے)

۵۔ لفظ شعور سے: وما یشعرون (۷) (یہ شعور سے کام نہیں لیتے۔)

۶۔ لفظ عقل سے: افلا تعقلون (۸) (تم عقل سے کام نہیں لیتے)

۷۔ لفظ تفکر سے: ان فی ذلک لایات لقوم یتفکرون (۹) (اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں)

۸۔ لفظ تدبر سے: افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها (۱۰) (یہ قرآن میں غور نہیں کرتے؟ کیا دلوں پر تالے پڑے ہیں؟)

۹۔ لفظ تو سم سے: ان فی ذلک لایات للمتوسمین (۱۵: ۷۴) (اس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں)

ان میں سے ہر لفظ عقل و تدبر اور غور و فکر کے ایک الگ پہلو کو واضح کرتا ہے اور کسی ذی فہم سے ان الفاظ کے تصور پوشیدہ نہیں۔ ہر لفظ عقل و دانائی، تفقہ و تدبر اور حکمت اور بصیرت کی ترغیب سے بھر پور ہے۔ لیکن اس حقیقت کو قرآن نے انتہا تک جس انداز سے پہنچایا ہے وہ بھی آپ اپنی مثال ہے۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ صم بکم عسی فہم لا یعقلون (۱۱) (یہ بہرے گوئے اندھے ہیں اس لئے عقل سے کام نہیں لیتے)

۲۔ ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون (۱۲) (خدا کی نگاہ میں بدترین مخلوق وہ بہرے گوئے ہیں جو سمجھ سے کام نہیں لیتے)

۳۔ ویجعل الرجس علی الذین لا یعقلون (۱۳) (جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ان پر اللہ پلیدی ڈال دیتا ہے)

۴۔ وقالو لو کان نسمع او نعقل ما کننا فی اصحاب السعیر (۱۴) (مکرمین کہیں گے کہ اگر ہم نے سنا اور عقل سے کام لیا ہوتا تو ہم جہنمی نہ بننے)

ذرا غور فرمائیے کہ عقل یا بے عقلی کی برائی میں اس سے بھی زیادہ کچھ کہا جاسکتا ہے؟ قرآن

پاک کی ان واضح آیات کے بعد کچھ اور بتانے کی ضرورت نہیں لیکن مسئلہ اور نکھر کر سامنے آجائے گا اگر بعض احادیث کا ذکر بھی کر دیا جائے۔

۱۔ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما أنه دخل على عائشة رضي الله عنها فقال يا ام المؤمنين! أرايت الرجل يقل قيامه ويكثر رُقادہ و آخر يكثر قيامه ويقل رقادہ أيہما أحب إليك؟ قالت: سألت رسول الله صلى عليه وسلم كما سالتني عنه، فقال أحسنهما عقلا قلت يا رسول الله! أسئلك عن عبادتهما، فقال يا عائشة! إنما يُستلان عن عقولهما، فمن كان أعقل كان أفضل في الدنيا والآخرة (۱۵)

(عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ وہ جناب عائشہ کے پاس گئے اور پوچھا کہ ام المؤمنین! ذرا بتائیے تو سہی کہ ایک شخص ہے جو شب بیداری کم اور آرام زیادہ کرتا ہے اور دوسرا شب بیداری زیادہ اور آرام کم کرتا ہے۔ آپ کو ان دونوں میں کون زیادہ پیارا ہے؟ جناب عائشہ نے فرمایا: جو سوال تم نے مجھ سے کیا ہے۔ بالکل وہی سوال میں نے رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے کیا تھا تو حضور نے جواب دیا: اے عائشہ! ان دونوں سے باز پرس تو عقل ہی کے بارے میں ہوگی۔ پس جو زیادہ صاحب عقل ہوگا، وہی افضل ہوگا۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔)

اس ارشاد نبوی سے واضح ہوتا کہ شب بیداری اور عبادت و ریاضت کا مقصد محض چند کلمات و حرکات یا چند مراسم کو ادا کر لینا نہیں بلکہ اس کا اصل مقصد عقل و شعور اور فقہ و بصیرت پیدا کرنا ہے۔ عقل کے متعلق باز پرس (انما یستلان عن عقولہما) بڑی معنی خیز حقیقت ہے۔ یعنی باز پرس یہ نہ ہوگی کہ تم نے کتنا پڑھا؟ مگر یہ باز پرس ضرور ہوگی کہ اس تہجد گزاری اور شب بیداری سے اپنے اندر عقل و فکر کی کتنی قوت و صلاحیت پیدا کی اور اس سے تمہاری سمجھ بوجھ میں کتنا اضافہ ہوا؟ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ عبادات کے ذریعے اسلام بے عقل نہیں بنانا چاہتا بلکہ لا انتہا ارتقا پذیر عقل و دانائی پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۲۔ عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما قال قال رسول الله صلى الله عليه

وسلم: لانعجبوا باسلام امرئ حتی تعرفوا عقدة علقه (۱۶) (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ کسی کے اسلام سے اس وقت تک خوش نہ ہو، جب تک اس کی محکم عقل کو نہ جان لو۔)

گویا معاملہ محض عبادات تک محدود نہیں بلکہ پورے اسلام کا مقصد ہی عقل و دانش پیدا کرنا ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ اسلام تو سراپا عقل و حکمت ہے۔ وہ اپنے پیروں کو بہرا، گونگا، اندھا اور بے عقل بنانا نہیں چاہتا۔ عاقل و فراز نہ بنانا چاہتا ہے۔ ایسا شعور پیدا کرنا چاہتا ہے کہ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھے اور ہر بات عقل کی ترازو پر پوری اترے۔

۳۔ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ قَالَ: أَلَا لَأَخِيرَ فِی قِرَاءَةِ لَيْسَ فِيهَا تَذَكُّرٌ وَلَا عِبَادَةٌ لَيْسَ فِيهَا تَفَقُّهُ (۱۷) سیدنا علی فرماتے ہیں: سن لو کہ جس قرأت میں تذکر اور جس عبادت میں تفقہ نہ ہو، اس میں کوئی خیر نہیں۔

یہ روایت حسن اتفاق سے اہل سنت اور اہل تشیع دونوں میں متفق علیہ ہے۔ اصول کافی میں بھی تقریباً یہی الفاظ سیدنا علی سے مروی ہیں (۱۸) اللہ اور اس کے رسول کے یہ ارشادات آپ کے سامنے ہیں۔ اس کے بعد خود فیصلہ کیجئے کہ غور و فکر کا حق سلب کر لینا عقل و شعور اور تفکر و تدبر پر عقل لگا دینا اور اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند کر دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ آپ نے اکثر یہ الفاظ بعض لوگوں کی زبان سے سنے ہوں گے: ”یہ دین کا معاملہ ہے۔ اس میں عقل کا کیا کام ہے؟ بس ایمان لے آنا چاہئے“ اور کوئی چون و چرا نہیں کرتی چاہئے۔ معلوم نہیں ایمان اور عقل میں تناقض کیوں فرض کر لیا گیا ہے؟ عقل سلیم یا غور و تدبر سے تو ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس گوشے کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ وہ عباد الرحمن کی ایک صفت یوں بیان فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخُرُوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا﴾ (۱۹)

جب انہیں آیات ربانی کی یاد دلائی جاتی ہے تو ان پر بہرے اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے۔

یعنی آیات ربانی کو بھی بے سمجھے ہو مجھے محض خوش اعتقادی سے نہیں مان لیتے بلکہ شعوری و عقلی طور پر سمجھ بوجھ کر ان پر ایمان لاتے ہیں۔ یوں ہی بے شعور و عقل بہروں، اندھوں کی طرح آیات ربانی پر نہیں گر پڑتے بلکہ ان کے فلسفہ و حکمت کو بھی سمجھتے ہیں۔ مصالح کے تمام پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ انطباق کے مواقع کو بھی پہنچاتے ہیں۔ سیاق و سباق اور دوسرے احکام سے اس کے ربط کا بھی فہم رکھتے ہیں۔ نیز نئے نئے حقائق کے موتی نکالنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ یہ ہے بہرے اندھے ہو کر نہ گرنے کا مطلب۔ اگر قرآن پر بے سمجھے ہو مجھے بہرے اندھے بن کر ایمان لانا ضروری ہو تو عقل و تدبر کو غیر ضروری فرض کر لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ربانی کلام کے بعد انسانی کلام کی کورانہ تقلید کی بھی عادت پڑ گئی اور تقلید جامد گویا جزو ایمان بن کر رہ گئی۔ ربانی کلام اور انسانی تعبیر و تفسیر کا فرق کسی وقت آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ کسی حکم الہی کی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو یہ ہمارا قصور فہم ہوگا مگر اس کے پر حکمت ہونے پر ایمان رکھنا ضروری ہوگا۔ لیکن انسانی تعبیر و تفسیر کے حتمی ہونے پر ایمان لانا اور بے سمجھے ہو مجھے تسلیم کر لینا ضروری نہیں۔ اگر وہ کتاب و حکمت کے مطابق نظر آئے گی تو مان لی جائے گی ورنہ مفسر کی نیک نیتی کو تسلیم کرنے کے باوجود اسے رد کیا جاسکتا ہے۔

عقل و فہم خدا کی دی ہوئی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اگر اس سے کام نہ لیا جائے تو اس کا رنگ آلود ہو جانا یقینی ہے۔ اس رنگ آلودگی کا نتیجہ ہے کہ ہم نے اپنے اسلاف کے متعلق تقریباً وہی پوزیشن اختیار کر لی ہے جو اہل کتاب اور مشرکوں نے اختیار کر رکھی تھی۔ ان سے جب کسی غلطی کو ترک کر کے راہ راست پر آجانے کی فرمائش کی جاتی تو ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ ﴿بل ننتبع ما الفینا علیہ آباءنا﴾ (۲۰) (ہم تو اسی بات کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے بزرگوں کو پایا ہے) ﴿ووجدنا علیہ آباءنا﴾ (۲۱) (ہم نے تو اپنے باب داد کو اسی

روش پر پایا ہے۔)

اس قسم کی وہ تقلید جامد ہے جس کے متعلق مولانا رومی نے کہا ہے۔ چند صد لعنت بریں تقلید بات یہ ہے کہ جب عقلی و فکری صلاحیتیں کمزور پڑ جاتی ہیں تو جمود پیدا ہو جاتا ہے اور ارتقا پریر ممکنات کی نمود ختم ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں آسان راستہ یہی نظر آتا ہے خود سر کھپانے کی بجائے دوسروں کی فکر پر کلی اعتماد کر لیا جائے۔ خود سوچنے میں خطا کا امکان ہے لہذا یہ خطرہ کیوں مول لیا جائے؟ کیوں نہ اپنے برے بھلے کی ذمہ داری کسی اور کے کاندھوں پر ڈال دی جائے؟ قید اسی پہل انداز زیست کا نام ہے۔ اس کا ایک سبب تو علم، قوت فکریہ اور حریت ضمیر کی کمی ہے۔ اور دوسرا سبب ایک مجبورانہ حالت بھی ہے۔ جب انسان معاشی کاروبار اور دوسرے دھندوں میں بچس جاتا ہے تو اس کے پاس اتنا موقع و وقت نہیں ہوتا کہ وہ نازک مسائل کی باریکیوں پر غور کرے۔ اس طرح کی مجبوریوں میں اس کے لئے یہی مناسب ہے کہ وہ دوسروں کی تحقیق پر مقلدانہ اعتماد کرے۔ ایسے لوگوں کو اجتہاد کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ وہ صرف اپنے فن میں مجتہد ہو سکتے ہیں۔

تقلید ایک ابتدائی ضروری قدم ہے مگر کوئی نصب العین اور آخری مقصد نہیں۔ ایک بچہ ابتداء میں اپنے معلم کا مقلد ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایک دن وہ خود پڑھنے اور دوسروں کو پڑھانے کے لائق ہو جاتا ہے یہی صورت معاشرے کی بھی ہے۔ جس میں ایک طبقہ عوام مقلد ہوتا رہے گا لیکن اسی میں سے وہ افراد بھی پیدا ہوتے رہیں گے جو تقلید کے ابتدائی زینوں سے گزر کر بام اجتہاد پر فائز ہو جائیں انہیں کو اولوالا حلام والہی یا ارباب حل و عقد کہتے ہیں۔ امت میں انکا وجود محض درجہ اباحت میں نہیں بلکہ واجبات میں ہے۔ آئیے ذرا کتاب و سنت میں بھی اسے تلاش کریں۔

ارشاد قرآنی ہے۔ ﴿وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَالْأُولَى الْأَمْرُ مِنْهُمْ لَعَلَّهُمُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ﴾ (۲۲) (اگر وہ (امن یا خوف کی باتوں کو) رسول اور اپنے

اولی الامر تک لے جاتے تو ان کے استنباط کرنے والے لوگ اسے معلوم کر لیتے۔

یہ استنباط کیا ہے؟ یہ اجتہاد ہی کا دوسرا نام ہے اور ہر فن کا ماہر اس کی صلاحیت رکھتا ہے وہ مسلمات اور کلیات کی روشنی میں پیش آمدہ پیچیدگی کو سلجھاتا ہے اور یہی اس کا اجتہاد ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَلْيُؤْذَنُوا بِغَيْرِ عَزْمٍ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ﴾ (۲۳) (تو ان میں سے ہر گروہ میں سے ایک جماعت ایسی کیوں نہ نکلی جو دین میں تفقہ حاصل کرتی؟ یہ تفقہ فی الدین آخر کیا چیز ہے جسے قرآن ایک طبقے کے لئے ضروری قرار دے رہا ہے۔ یہ حکم صرف عہد رسالت کے لئے تھا یا پوری امت کے لئے ایک دواوی حکم ہے؟ کیا یہ تفقہ فی الدین اجتہاد ہی کا دوسرا نام نہیں؟ اور کیا قرآن نے کسی دور کے لئے اس تفقہ کا دروازہ بند بھی کیا ہے؟ ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے۔

قرآنی ارشادات کے بعد ہمارے سامنے حدیث رسول آتی ہے جو قرآن کی سب سے بہتر تفسیر ہے۔ اس سلسلے میں ہماری نظر سب سے پہلے اس مشہور حدیث معاذ پر جاتی ہے جو اس مضمون پر فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمَّا أَرَادَ أَنْ يَبْعَثَهُ - أَيْ مُعَاذًا - إِلَى الْيَمَنِ، قَالَ لَهُ: كَيْفَ تَقْضِي؟ إِذَا عَرِضَ لَكَ قَضَاءٌ، قَالَ: أَقْضِي بِكِتَابِ اللَّهِ، قَالَ: إِنْ لَمْ تَجِدْ فِي كِتَابِ اللَّهِ؟ قَالَ أَقْضِي بِسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ، قَالَ: فَإِنْ لَمْ تَجِدْ فِي سُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ وَلَا فِي كِتَابِ اللَّهِ؟ قَالَ أَجْتَهِدُ بِرَأْيٍ وَلَا أَلْ، فَصَرَبَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صِدْرَهُ، وَقَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِهِ لِمَا يَرْضَى رَسُولُ اللَّهِ (۲۴)

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب (حضرت) معاذ کو والی یمن بنا کر بھیجنا چاہا تو ان سے پوچھا:

تمہارے پاس کوئی مقدمہ آئے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ عرض کیا: اللہ کی کتاب سے۔
فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ ملے؟ عرض کیا پھر سنت رسول اللہ کے مطابق۔ فرمایا: اگر سنت
رسول اللہ اور کتاب اللہ دونوں میں نہ ملے؟ جواب دیا: میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا
اور کوئی کوتاہی نہ کروں گا۔ حضورؐ نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: اللہ کا شکر ہے جس نے
اپنے رسول کے فرستادہ کو اس چیز کی توفیق بخشی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے۔)

اس حدیث سے دو باتیں تو واضح طور پر ثابت ہوتی ہیں: ایک یہ کہ کتاب و سنت میں قیامت تک
ہونے والے جزییات موجود نہیں اور وہیں اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ اجتہاد رضائے
رسول ہے۔ دوسرے یہ کہ اجتہاد حضرت معاذ کے ساتھ مخصوص نہیں ورنہ حضورؐ خصوصاً لك
من دون المومنین ﴿﴾ بھی فرما دیتے۔ نیز پھر کوئی صحابی مجتہد نہ ہو سکتا اور ائمہ اربعہ کو مجتہد
ہونے کا حق نہ ہوتا۔ ہمارے اس بیان کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جو یوں ہے:

۲۔ اذ حکم الحاكم فاجتهد فاصاب فله اجران واذا حکم فاجتهد فاختا فله
اجر (۲۵) (جب قاضی اپنے اجتہاد سے ٹھیک فیصلہ دے تو اسے دو ہراجر ملتا ہے۔) (ایک اجتہاد کا
دوسرا صابت کا) اور اگر وہ اجتہادی فیصلے میں غلطی کر جائے تو ایک اجر ملے گا (صرف اجتہاد کا)

اس حدیث سے بھی دو باتیں بڑی وضاحت سے ثابت ہوتی ہیں: ایک یہ کہ یہ حق
اجتہاد صرف حضرت معاذ یا کسی معاصر کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر اس شخص کے لئے ہے جو
منصب قضا پر مامور ہو۔ دوسرے محض غلطی کے امکانات سے ڈر کر اجتہاد سے دستکش رہنا ایک اجر
کو ضائع کرنا ہے۔

زندگی کے ارتقا پر یہ ممکنات اجتہاد ہی سے وابستہ ہیں اور اس کا دروازہ وہ رسول
کیسے بند کر سکتا تھا جس کا سب سے بڑا کارنامہ ہی یہ ہے کہ وہ ممکنات حیات کو بروئے کار
لائے اور دنیا کو ارتقا پریری کی راہ سے روشناس کرائے۔

ان احادیث کے ساتھ دو ”اثر“ بھی ملا لیجئے تو بات اور زیادہ واضح ہو جائے گی یہ دونوں سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے مکتوبات ہیں: ۱: آپ نے سیدنا قاضی شریح کو لکھا: اقصیٰ بما فی کتاب اللہ فان لم یکن فبسنة رسول اللہ فان لم یکن فی کتاب اللہ ولا فی سنة رسول اللہ فاقض بما قضی بہ الصالحون فان لم یکن فیما قضی بہ الصالحون فان شئت فنتاخر ولا اری التاخر الا خیر لک (۲۶) (فیصلہ کتاب اللہ سے کرو۔ اگر وہاں نہ ہو تو سنت رسول اللہ سے کام لو۔ اگر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں میں نہ ہو تو صالحین کے اجتہادی فیصلے کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر صالحین کے فیصلوں میں بھی نہ ملے تو خواہ بروقت کوئی فیصلہ کرو یا ذرا غور و فکر کے بعد کرو۔ اور میری رائے میں تمہارے لئے ذرا غور و فکر کر لینا ہی بہتر ہے۔)

۲۔ سیدنا ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو آپ نے یہ لکھا: الفہم الفہم فیما اختلج بہ صدرك مما لکم یبلغک فی الكتاب والسنة واعرف الامثال والا شباہ ثم قس الامور عند ذلك۔ (۲۷) (جس معاملے کا سراغ کتاب و سنت میں نہ ملنے کی وجہ سے تمہارے دل میں خلجان پیدا ہو، وہاں عقل و فہم سے کام لو اور نظائر پر معاملات کو قیاس کر لو۔)

اس ارشاد فاروقی میں کتاب و سنت کے علاوہ ایک اور چیز کا اضافہ ہے یعنی صالحین کے فیصلوں کو بھی بطور نظائر (PRECEDENTS) سامنے رکھنا چاہئے۔ اور کہیں کوئی واضح حکم و فیصلہ نہ ملے تو قیاس سے کام لینا چاہئے۔ یہی قیاس اجتہاد ہوتا ہے جس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ معاشرے کی تشکیل اور زندگی کے تقاضے ہر روز نئے مسائل پیدا کرتے رہتے ہیں۔ زندگی کے ممکنات لامتناہی اور اس کے تنوعات بھی لامحدود ہیں۔ قیامت تک ہونے والے واقعات کی جزئی جزئی تفصیلات اور ان کے فیصلے کسی کتاب میں نہیں سما سکتے۔ لہذا اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے کوئی معنی نہیں۔

یہاں ایک ضروری گزارش بھی سن لیجئے مگر ذرا غور سے سنیے۔ عقل و تدبر اور قیاس و اجتہاد کے حق میں آپ نے کتاب اللہ اور اخبار و آثار کے کچھ دلائل سن لئے۔ ہمیں افسوس ہے اس کے خلاف ہمیں کوئی دلیل نہ مل سکی۔ نہ قرآن میں نہ حدیث نہ آثار صحابہ میں۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ یہ دعویٰ کیوں اور کس دلیل سے کیا گیا کہ اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے؟ یہ خود ایک اجتہاد ہے۔ لہذا اگر واقعی اجتہاد کا دروازہ بند کرنا ہے تو سب سے پہلے خود اس اجتہاد کا دروازہ بند کیجئے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اگر کچھ لوگ اجتہاد سے یہ فرما سکتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے تو دوسروں کو یہ اجتہاد کرنے کا بھی حق ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لئے کھلا ہے۔ دونوں اجتہادوں میں فرق صرف یہ ہوگا کہ ایک کے لئے کوئی دلیل نہیں اور دوسرے کے حق میں نقلی دلائل بھی ہیں اور عقلی بھی۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ جسے چاہیں اختیار کر لیجئے۔

مگر ذرا مٹھریے! صرف دلائل پر اکتفا نہ کیجئے۔ امت کا تعامل کیا جا رہا ہے اسے بھی دیکھتے چلئے۔ خود حضور ﷺ کے عہد میں بھی اجتہاد ہوتا رہا ہے اور حضور ﷺ نے اس کی تصویب فرمائی ہے اور حضور ﷺ کے بعد تو اس قدر بہتات سے اجتہاد ہوتا رہا ہے کہ اس کا شمار ہی مشکل ہے۔ عہد نبوی کی ایک مثال لیجئے۔ اوس بن صامت اپنی بیوی خولہ بنت ثعلبہ کو ماں سے تشبیہ دیتے ہیں جسے اصطلاح فقہ میں ظہار کہتے ہیں۔ حضور ﷺ قدیم رواج کے مطابق فرماتے ہیں کہ تم دونوں میں ابدی جدائی ہو گئی اور باہم ملنے کی صورت نہیں۔ خولہ کہتی ہیں کہ یہ طلاق کیسے ہو سکتی ہے جبکہ وہ لفظ طلاق بولا نہیں اور میں اس کی ماں کس طرح ہو سکتی ہوں جبکہ میں نے اسے جنا نہیں۔ اس منظر کو آنکھوں کے سامنے لائیے کہ ایک طرف ایک معمولی عورت ہے اور دوسری طرف معلم الکتاب والحمۃ سراپا عقل و دانائی ہے۔ عورت اس پیغمبر کی عقل و حکمت سے جھگڑتی ہے اور اپنا قیاس بھی پیش کرتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وحی الہی اس عورت کی تائید میں نازل ہوتی ہے۔ اٹھائیسویں پارے کی پہلی سورت کا نام ہی سورہ مجادلہ ہے۔ جس کا آغاز یوں ہے:

﴿قَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّتِي تُجَادِلُكَ فِي زَوْجِيهَا﴾ (۲۸) (اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ ﷺ سے اپنے شوہر کے بارے میں مجادلہ و مباحثہ کرتی رہی۔)

اسی طرح جب میدان بدر میں اسلام و کفر کا پہلا معرکہ پیش آ رہا تھا، حضور ﷺ نے پڑاؤ کے لئے ایک جگہ متعین فرمائی۔ جناب بن منذر نے عرض کیا کہ اگر یہ جگہ وحی سے نہیں پسند کی گئی ہے تو فلاں جگہ پڑاؤ کے لئے موزوں تر ہے۔ حضور ﷺ نے جناب کی رائے مان لی اور پڑاؤ کی جگہ بدل لی۔ جناب جناب نے اپنے قیاس و عقل ہی سے یہ معروضہ پیش کیا تھا۔ (۲۹)

پھر حضور ﷺ کے بعد ہی جو اجتہادات صحابہ کے ہوئے ہیں، وہ تو بے شمار ہیں۔ ان میں قابل غور و اجتہادات ہیں جہاں احکام و عمل کی اسپرٹ اور لچک کو محفوظ و ملحوظ رکھتے ہوئے بعض منصوصات و معمولات تک میں تبدیلی کر دی گئی۔ صرف چند مثالیں سن لیجئے:

۱۔ قرآن نے مولفۃ القلوب کو صدقہ دلوا یا ہے۔ سیدنا ابا بکر صدیق نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہما کی رائے سے اسے بند کر دیا۔ (۳۰)

۲۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تو بے شمار اجتہادات ہیں جو عہد نبوی کے صریح فیصلوں کے خلاف ہیں مثلاً

(الف) عہد نبوت میں عورت کا نام لے کر تسمیہ کی جاتی تھی۔ جناب کعب بن مالک کا قصیدہ بہترین نعت تسلیم کیا گیا ہے، جس کے ایک شعر پر حضور نے اپنی چادر مبارک کعب کو انعام میں مرحمت فرمادی۔ اس قصیدے کا آغاز ہی سعاد نامی عورت کے ذکر سے ہوا ہے۔ بانت سعاد قلبی الیوم مقبول، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں عورت کا نام لیکر تسمیہ کرنے سے روک دیا کیونکہ اس میں فحش کا ایک پہلو پیدا ہوتا ہے۔ (۳۱)

(ب) عہد نبوی میں جویہ اشعار پڑھے جاتے تھے اور خود حضورؐ نے حسان بن ثابت سے

مشرکوں کے جواب میں اشعار جو پڑھوائے ہیں۔ مگر سیدنا عمرؓ نے اس کی ممانعت فرمادی کیونکہ اس سے جاہلیت کی گزشتہ باہمی عداوتیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ (۳۲)

(ج) عہد نبوی میں مفتوحہ زمینیں مجاہدوں میں تقسیم ہوئی ہیں لیکن حضرت عمرؓ نے یہ سلسلہ بالکل ختم کر دیا کیونکہ آنے والی نسلوں کے لئے پھر کچھ باقی نہ رہے گا۔ (۳۳)

(د) عہد نبوی اور دور صدیقی میں بیک مجلس تین طلاقیں رجعی سمجھی جاتی تھیں (۳۴) مگر حضرت عمرؓ نے لوگوں کو کثرت طلاق سے روکنے کی غرض سے روکنے کی غرض سے ایسی تین طلاقوں کو مغلط قرار دیا اور پھر اس فیصلے پر شدید ندامت کا بھی اظہار فرمایا۔ (۳۵)

(ر) کتابیہ سے مناکحت کی اجازت قرآن نے دی ہے لیکن فاروق اعظم نے اپنے بعض گورنروں کو اس سے روک دیا کیونکہ کتابیہ کے مال و جمال کی طرف مسلمانوں کو زیادہ رغبت ہونے لگے گی تو مسلمان عورتوں کو رشتہ ملنے میں دشواریاں پیدا ہونے لگیں گے۔ (۳۶)

(د) عہد صدیقی تک ام ولد کی بیع ہوتی رہی۔ سیدنا عمرؓ نے اس سے روک دیا۔ (۳۷)

(ز) حلالہ کرنے یا کرانے والے کے لئے کتاب و سنت میں کوئی سزا نہیں بیان کی گئی ہے۔ سیدنا عمرؓ نے اس کے لئے رجم کی سزا کا اعلان فرما دیا کیونکہ یہ مناکحت کا نہایت غلط استعمال ہے۔

(ح) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز تراویح صرف ایک سال رمضان کے عشرہ اواخر کی فقط تین طاق راتوں میں پڑھی (۳۸) سیدنا فاروقؓ نے پورے ماہ ہر شب بیس رکعات باجماعت تراویح کا اہتمام فرمایا (۳۹)

(ط) اسی طرح حضرت عمرؓ نے گھوڑوں پر زکوٰۃ اور غنم پر خمس لگایا جو پہلے نہ تھا اور مختلف قسم کی کاشت پر خراج کی مختلف شرحیں مقرر فرمائیں جو پہلے نہ تھیں نیز مختلف ممالک کے قیدیوں کے فدیے بھی مختلف مقرر فرمائے حالانکہ پہلے یہ صورت نہ تھی۔ (۴۰)

(ع) خطبہ جمعہ کی اذان سے پہلے کوئی اذان نہ عہد نبویؐ میں تھی نہ دور صدیقی میں اور خلافت فاروقی میں۔ یہ اضافہ سیدنا عثمانؓ نے فرمایا کیونکہ لوگوں کی کاروباری مصروفیات اتنی زیادہ ہو گئی تھیں کہ اذان خطبہ سنتے ہی فی الفور آکر خطبہ جمعہ نہیں سن سکتے تھے۔ (۴۱)

مثالیں اور بھی بہت سی ہیں۔ یہاں سب کا احاطہ و شمار مقصود نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ حضورؐ کے بعد چند سالوں میں یہ تبدیلیاں ہوئیں حالانکہ اس دور کا تمدن سستا ہوا اور بڑی حد تک محدود تھا۔ پھر کون کہہ سکتا ہے کہ ان چودہ صدیوں میں کسی تبدیلی کی کبھی کوئی ضرورت نہ ہوئی ہوگی۔ خواہ تمدن نے کتنا ہی پھیلاؤ اختیار کر لیا ہو اور صنعتی و سائنسی ترقیوں نے سوسائٹی کا ڈھانچہ ہی کیوں نہ بدل دیا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ دین تو ناقابل تبدیل اصول زندگی کا نام ہے۔ لا تبدیل لکلمت اللہ ذلک الدین القیم (۴۲) لیکن شریعت کے تمام فروع دین کی طرح ناقابل تبدیل نہیں۔ دین تو وہ روح اور اسپرٹ ہے جو تبدیل نہیں ہو سکتی۔ اور شریعت اسی روح کی تشکیل کا نام ہے۔ مقصد اسپرٹ کو باقی رکھنا ہے اور شکل بدلنے سے اسپرٹ نہیں بدل جاتی۔

اجتہاد کے حق میں سب سے بڑی دلیل مختلف مذاہب کا وجود ہے۔ یہ مالکی، حنفی، شافعی، حنبلی اور دوسرے بہت سے اسلامی مذاہب کس طرح وجود میں آ گئے اگر اجتہاد کا دروازہ بند تھا تو ان بے شمار مذاہب اسلامیہ کی کیا توجیہ (JUSTIFICATION) ہو سکتی ہے؟

یہ سارے مذاہب دراصل خام مواد ہیں شریعت کے لئے۔ دین ہر ایک کا ایک ہی ہے اور وہ ہے اسلام۔ اگرچہ یہ شریعتیں مختلف ہیں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم جس فرقے یا مذہب سے تعلق رکھتے ہیں وہ تو عین اسلام ہے اور باقی مذاہب اسلام نہیں۔ آج یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ شریعت تو بن چکی اور

اس کی کسی بات میں بھی رد و بدل اور اضافہ و ترمیم جائز نہیں۔ ناقابل ترمیم صرف دین ہے اور شریعت ہر دور میں ترمیم قبول کر سکتی ہے۔ اور یہیں اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ترمیم شریعت کا یہ مطلب نہیں کہ شروع سے آخر تک سب کچھ بدل دیا جائے بلکہ:

(الف) ان شریعتوں میں جو چیز اپنے عصری تقاضوں کے مطابق ہوگی وہ باقی رکھی جائے گی۔ (ب) جس کی ضرورت نہیں اسے ترک کر دیا جائے گا۔

(ج) جس جدید شے کی ضرورت ہوگی اس کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ اور اس وقت صرف عالمی مصالح امت کو پیش نظر رکھا جائے گا۔ اور تمام شریعتوں کے خام مواد سے استفادہ کیا جائے گا۔ پھر یہی قوانین ایک خاص دور کی شریعت ہوں گے جب سب پر لاگو ہوں گے ایک اسلامی ملک میں دس قوانین یا شریعتیں ہونے کا کوئی مطلب ہی نہیں۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ جس دور کے لئے جو شریعت بنے گی وہ بھی ابدی نہیں ہوگی۔ ضرورت پیش آنے پر اس میں بھی حک و اضافہ ہوتا رہے گا۔ دین اور شریعت کے فرق کے لئے یوں سمجھنا چاہئے کہ انسان تغیر و ثبات کا مجموعہ ہے۔ اس کی آنا یا ذات یا EGO تغیر نا آشنا ہے لیکن اس کا جسم ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ اس تغیر سے اس کی شخصیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ٹھیک اسی طرح اسلام کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک حصہ ہمیشہ باقی و قائم رہنے والا اور وہی ہے دین قیم۔ اور دوسرا حصہ تغیر پذیر ہے جو ضرورت و مصلحت کے وقت بدل جاتا ہے اور یہی ہے شریعت۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب خلفائے راشدین کو یہ حق پہنچتا ہے کہ بعض شرعی منصوصات و معمولات کو بدل دیں تو کیا فضلاء امت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان خلفائے راشدین کے فیصلوں میں اسی وزن کی دوسری مصلحتوں کے پیش نظر حک و اضافہ کر دیں۔ اور اپنے اجتہاد سے کام لے کر ترمیم و اضافہ کا فریضہ ادا کریں۔ اجتہاد کا مطلب یہ نہیں کہ جو چاہے اور جس حکم کو چاہے اٹھا کر بدلنا شروع کر دے اور اجتہاد کا نام دے دے۔ جس طرح ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں اسی طرح یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہر کس و ناکس کو اجتہاد کا حق نہیں۔ اس کے لئے

کچھ شرائط ہیں اور ہر فن کا یہی حال ہے کہ مہارت رکھنے والا اس فن میں رائے دے سکتا ہے۔ اجتہاد کے لئے ضروری ہے کہ:

- ۱۔ کسی حکم میں رد و بدل اسی وقت ہو جب شدید ضرورت ہو۔
- ۲۔ وہ حکم اضافہ یا پیدگی کا واقعی حل ہو۔
- ۳۔ تبدیل و ترمیم ارباب حل و عقد کریں اور اس میں خیر غالب کا خیال رکھیں۔
- ۴۔ اساسی اقدار دین مجروح نہ ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے ضروری شرائط اجتہاد کا ذکر کیا ہے۔ تفصیل میں جانا مقصود نہیں۔ ہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اب فاروق اعظمؓ اور امام اعظمؒ جیسے لوگ کہاں ہیں جو اجتہاد کا حق ادا کر سکیں، یعنی اب ایسے لوگ نہیں اس لئے اجتہاد بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر یہی استدلال کا انداز رہا تو کل یہ بھی کہا جائے گا اب علی مرتضیٰؒ جیسے مخلص مجاہد کہاں جو دشمن کے تھوکنے کے بعد اس کے سینے سے اتر آئیں؟ لہذا اب قتال فی سبیل اللہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اب عمر فاروقؓ جیسے عادل و انصاف والے لوگ کہاں ہیں جو قحط میں گھٹی کھانا چوڑ دیں اور اپنے فرزند کو بھی درے لگانے سے دریغ نہ کریں۔ لہذا اسلامی نظام عدالت قائم کرنے کا خیال چھوڑ دیں اب امام ابو حنیفہؒ جیسے عالم و متقی فقیہ کہاں ملیں گے اس لئے درس فقہ کو بھی ختم کر دینا چاہیئے۔ عرض اس قسم کے خدشات و شبہات کو ہم وسعت دیتے چلے جائیں تو زندگی کے ہر موڑ پر مایوسی ہی مایوسی نظر آنے لگی گی اور پورے اسلام ہی سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اس نوع کی مایوسانہ باتوں سے نہ تو زندگی کی تعمیر ہو سکتی ہے نہ معاشرتی مسائل کا حل نکل سکتا ہے۔ ہر دور کے مسائل کا حل یوں ہی نکل سکتا ہے کہ ہر مسئلے کے ارباب حل و عقد ماہرین جیسے بھی اس دور میں میسر آئیں۔ اجتہاد کریں اور غلطی کے منطقی امکانات سے خوف نہ کھائیں۔ غلطی کے امکانات تو صدر اول میں بھی موجود تھے۔ اگر یہ امکانات نہ

ہوتے تو فقہ کا مسئلہ کہاں سے بنتا کہ مجتہد کی رائے غلط بھی ہو سکتی ہے اور ٹھیک بھی (الجمہد منخطی و یصیب) اور پھر حضورؐ یہ کیوں فرماتے کہ ٹھیک رائے دینے والے کے لئے دوا اجر ہیں اور غلطی کرنے والا ایک اجر کا مستحق ہے۔ خطا اور غلطی ہی تو انسان کا مایہ الا امتیاز و وصف ہے۔ غلطی و خطا ہی تو انسان کو ارتقاء کی طرف لے جاتی ہے۔ جمادات و حیوانات غلطی نہیں کرتے اس لئے ان میں عقلی ارتقاء بھی نہیں۔ انسان غلطی کرتا ہے تو اس کی تلافی کرتا ہے۔ ٹھوکر کھاتا ہے تو سنبھلتا ہے اور اسی طرح کے تجربات اسے ارتقاء کی طرف لے جاتے ہیں ورنہ وہ ایک سی جامد حالت میں پڑا رہے اور بے خطا جانوروں پر اسے کوئی شرف حاصل نہ ہو۔ قرآن کریم نے جو قصہ آدم بیان کیا ہے اس میں بڑی خوبی سے یہ حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ خطا کا آدم کو بے خطا فرشتوں پر کیوں فضیلت حاصل ہوئی اور معصوم و بے خطا مخلوق کے ہوتے ہوئے خلافت ارضی خطا کار مخلوق کے سپرد کیوں کی گئی۔

اگر آج علی و خالد و ضرار رضی اللہ عنہم نہ ہونے کے باوجود ہم جہاد و قتال کر سکتے ہیں اگر عمر اور شریع کے موجود نہ ہونے پر بھی نظام عدالت قائم کر سکتے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ابو حنیفہؒ شافعیؒ کے نہ ہونے کے باوجود اجتہاد کو ختم کر دیا جائے۔ دروازہ نہ اس کا بند ہے نا اس کا۔ اجتہاد کا مطلب ائمہ مجتہدین سے سر تابی نہیں بلکہ انہی کی مساعی مشکورہ سے فائدہ اٹھانے کا نام اجتہاد ہے۔ یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ اجتہاد محض جائز کی حد تک نہیں۔ یہ جواز و عدم جواز سے بلند تر حقیقت ہے۔ یہ ایک فطری تقاضا ہے جو اپنی نمود چاہتا ہے اور زندگی کے ہر ہر گوشے میں اس کی طلب موجود ہے۔ اگر ہم اس فطری مطالبے کو حسن و خوبی کے ساتھ پورا نہیں کرتے تو اس سے خود ہمارا اپنا نقصان ہوگا۔ محض جائز و ناجائز کہہ کر الگ ہو جانے سے کسی مسئلے کا حل نہیں نکالا کرتا۔ آج کے ایسی دور نے زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔ نئے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں، جن کا حل اجتہاد کے بغیر نہیں نکل سکتا۔ مثلاً انشور کرانا، بیکاری اور اس کا منافع، خاندانی منصوبہ بندی۔ ایک کا خون دوسرے کے جسم میں ڈالنا، مرنے والے کی رضا مندی سے اس کی آنکھ یا کوئی حصہ جسم

زندوں کے کام میں لانا۔ زمین یا دوسرے ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت قرار دینا۔ رویت ہلال کے لئے فلکیات پر اعتماد کرنا، عورتوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کا مقام اور پردے کی حد متعین کرنا، بعض جائز چیزوں مثلاً تعداد ازواج، کسی کی شادی، طلاق، دعوت، ذبائح، سفر حج وغیرہ پر بعض پابندیاں عائد کرنا، جہیز کی اصلیت، حضانت کی مدت، مفقود الخمر کی میعاد، فوٹو گرافی، موسیقی، مصوری وغیرہ اور اس قسم کے اور بہت سے مسائل ہمارے دور کے مسائل ہیں جن کا تعلق براہ راست ہماری زندگی سے ہے۔ یہ روزہ مرہ کے مسائل اجتہاد ہی سے حل ہو سکتے ہیں۔ ان میں بعض مسائل تو وہ ہیں جن کا ذکر قدیم کتب فقہ میں سرے سے موجود نہیں اور بعض وہ ہیں جو ہماری کتب فقہ میں موجود ہیں لیکن وہ عوام کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں یا اوجھل رکھے گئے ہیں۔ اور کچھ مسائل ایسے بھی ہیں جو کسی خاص دور کے لئے تھے اور اب تک ہم اسی پر قائم ہیں۔ حالانکہ نقشہ زندگی بدل جانے کی وجہ سے اب ان پر قائم رہنا ضروری نہیں۔

ہم اپنی توانائیوں کا بڑا حصہ ایسے مسائل میں بھی صرف کر چکے ہیں جن کے متعلق نہ آخرت میں باز پرس ہوگی اور نہ دنیا میں کچھ کام آئیں گے۔ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں؟ آغضویہ علیہ السلام کو علم غیب تھا یا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں یا نہیں؟ صحابہ میں کون افضل ہے اور کون مفصول؟ اصحاب کہف کے کتے کا رنگ سیاہ تھا یا سفید؟ براق کا گوشت حلال ہے یا حرام؟ حضرت مسیح جو تھے آسمان پر زندہ ہیں یا نہیں؟ ان جیسے مسائل پر ہم نے اپنی بہت سے توانائیاں صرف کر دی ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ عقل اور اجتہاد سے کام لے کر ان مسائل کو حل کریں جن کا براہ راست ہماری زندگی سے تعلق ہے۔ اگر ہم اس فریضے میں کوتاہی کریں گے۔ تو زمانہ ہماری پروا کئے بغیر آگے بڑھتا جائے گا۔

چچ پوچھے تو زمانہ خود ہی ایک بڑا موثر مفتی ہے۔ لوگ خود ہی اس کا فتویٰ مان لیتے ہیں لیکن بعد از خرابی بسیار۔ آج سے تین پینس سال پہلے جب پہلی بار بمبئی میں لاؤڈ سپیکر سے خطبہ عید کا کام لیا گیا تو اکثر علماء نے اس کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا اور دیکھتے دیکھتے اب یہ صورت

ہو گئی کہ بے ضرورت شور سے روکنے کے لئے اگر حکومت لاؤڈ اسپیکر کہیں بند کرتی ہے تو یہی علماء شور مچاتے ہیں کہ حکومت تبلیغ دین اور اشاعت اسلام کو بند کرتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آج ہم جو باتیں عرض کر رہے ہیں ان کو یہ حضرات کچھ دنوں بعد انشاء اللہ مان لیں گے کیونکہ زمانہ خود بہترین مفتی ہے۔

حواشی و حوالہ جات

- ۱۔ القرآن: ۱۵۱/۲
- ۲۔ القرآن: ۲۶۹/۲
- ۳۔ القرآن: ۲۶۹/۲
- ۴۔ القرآن: ۳/۵۹
- ۵۔ القرآن: ۷۳/۲۸
- ۶۔ القرآن: ۸۱/۹
- ۷۔ القرآن: ۹/۲
- ۸۔ القرآن: ۴۴/۲
- ۹۔ القرآن: ۲/۱۳
- ۱۰۔ القرآن: ۲۴/۴۷
- ۱۱۔ القرآن: ۱۷۲/۲
- ۱۲۔ القرآن: ۲۳/۸
- ۱۳۔ القرآن: ۱۰۰/۱۰
- ۱۴۔ القرآن: ۱۰/۶۷
- ۱۵۔ کتاب الاذکیاء
- ۱۶۔ ایضاً ص ۴
- لا ابن الجوزی، طبع مصر، ص ۴
- ۱۷۔ مسند داری
- ۱۸۔ اصول کافی مطبوعہ نو کشور، ص ۱۹
- ۱۹۔ القرآن: ۷۳/۲۸
- ۲۰۔ القرآن: ۱۷۰/۲
- ۲۱۔ القرآن: ۱۰۴/۵
- ۲۲۔ القرآن: ۸۳/۴

- ۲۳۔ القرآن: ۱۲۳/۹۔ ابو داؤد: جلد ۲، ص ۵۰۵
- ۲۴۔ کنز العمال
- ۲۵۔ ابو داؤد: جلد ۲، ص ۵۰۳
- ۲۶۔ القرآن: ۱/۵۸۔ مسند داری: ص ۳۲، اذلیۃ الخفاء، ص ۸۶
- ۲۷۔ البدایۃ والنہایۃ: ج ۳، ص ۲۹۷، مطبوعہ مصر
- ۲۸۔ آغانی لابی الفرق الاصبہانی، ۵: ۴ مطبوعہ مصر
- ۲۹۔ کتاب الخراج: ص ۲۳، ۲۴
- ۳۰۔ المسلم: جلد ۲، ص ۱۸۲، طبع مصر
- ۳۱۔ اغاثۃ الہفان لابن قیم: ص ۱۸۱، مطبوعہ مصر
- ۳۲۔ استن ابی داؤد: جلد اول، ص ۱۹۵
- ۳۳۔ ابن حبان
- ۳۴۔ نیز الفاروق شلی
- ۳۵۔ سنن ابی داؤد: جلد اول، ص ۱۵۵، طبع کراچی
- ۳۶۔ القرآن: ۳۰/۳۱



أَذْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (القرآن)
آپ اپنی دانشمندانہ گفتگو اور نصیحت مندانہ خطاب کے ذریعہ اپنے رب کی جانب دعوت دیجئے

آپ ﷺ کی گفتگو و خطاب کا طریقہ سیرت طیبہ ﷺ کی روشنی میں

(خطیبوں، سیاست دانوں، لیڈروں، اساتذہ اور طالب علموں کے لئے رہنما کتاب)

مصنف

پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین ثار

پرنسپل

قائد ملت گورنمنٹ ڈگری کالج

لیاقت آباد قاسم آباد کراچی

ناشر

مکتبہ یادگار شیخ الاسلام پاکستان علامہ شبیر احمد عثمانی